ازعدالتِ عظمیٰ

تاریخ فیصلہ:16،23نومبر،،1953

سریندر سنگھ ودیگراں

بنام

دی سٹیٹ آف اترپردیش

[مکھرجی،ویوین بوس،اور بھگوتی جسٹس صاحبان]

ضابطہ عمل-فیصلہ-دوججوں کے ذریعے سنا گیا مقدمہ-دونوں کے دستخط شدہ فیصلہ-ان میں سے ایک کی موت-دوسرے کے ذریعے سنایا گیا-فیصلے کا جواز-الہ آباد عدالت عالیہ قوائد،1952،بابVII، قوائد1-4۔

جہاں ایک کیس کی سماعت دو ججوں کی بنچ نے کی تھی اور فیصلے پر ان دونوں کے دستخط تھے لیکن دوسرے کی موت کے بعد ان میں سے ایک نے اسے عدالت میں پیش کیا تھا: **حکم ہوا**، کہ کوئی درست فیصلہ نہیں تھا اور کیس کی دوبارہ سماعت ہونی چاہیے۔

فیصلہ عدالت کا حتمی فیصلہ ہوتا ہے جو فریقین اور دنیا کو بھری عدالت میں باضابطہ "اعلان یا" حوالگی " کے ذریعے آگاہ کیا جاتا ہے اور جب تک کوئی فیصلہ نہیں دیا جاتا تب تک ججوں کو اپنا ذہن تبدیل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

فرم گوکل چند بنام فرم نند رام (اے۔ آئی۔ آر۔ 1938 پی۔ سی۔ 292) اور محمد اکیل بنام اسادو نیسا بی (9ڈبلیو۔ آر۔ 1 ایف۔بی) کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اپیلیٹ فوجداری کا دائرہ اختیار: فوجداری اپیل نمبر 34، سال 1953۔

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

سیشن جج کی عدالت کے 19 جنوری 1952 کے فیصلے اور حکم سے پیدا ہونے والے فوجداری اپیل رجسٹر نمبر 24، سال 1952 اور سزائے موت کے رجسٹر نمبر 4، سال 1952 میں الہ آباد (لکھنؤ بنچ)، لکھنؤ (قدوائی اور بھارگوا جسٹس صاحبان) میں ہائی کورٹ کے 5 جنوری 1953 کے فیصلے اور حکم سے اپیل، سیتاپور، سیشن کیس نمبر 97، سال 1951 میں۔

اپیل کنندہ کے لیے جیے گوپال سیٹھی (کے پی گپتا، اس کے ساتھ)۔

مدعاعلیہ کی طرف سے جی سی ماتھر اور او نکر ناتھ سریواستو۔

16.1953 نومبر۔ عدالت کا فیصلہ جسٹس بوس نے سنایا-

ہمارے سامنے تین اپیل کنندگان ہیں۔ سب پر ایک بابو سنگھ کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے صرف سریندر سنگھ کو قتل کا مجرم قرار دیا گیا اور اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ دیگر دو کو تعزیرات تعزیرات ہند 225 کے تحت مجرم قرار دیا گیا۔ ہر ایک کو تین سال کی قید بامشقت اور 200 روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔

تینوں نے الہ آباد (لکھنؤ بنچ) میں عدالت عالیہ میں اپیل کی اور کدوائی اور بھارگو جسٹس صاحبان کے ذریعے فلتھ دسمبر 1952 کو اپیل کی سماعت ہوئی۔ فیصلہ محفوظ کر لیا گیا۔ اس کی فراہمی سے پہلے ہی جسٹس بھارگو کو الہ آباد منتقل کر دیا گیا۔ وہاں رہتے ہوئے اس نے اپنے اور اپنے بھائی جج کی طرف سے ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے ایک "فیصلہ" کا حکم دیا، یعنی یہ کہ یہ ایک مشترکہ فیصلہ تھا: اس نے ضمیر "ہم" استعمال کیا نہ کہ "میں"۔ انہوں نے "فیصلے" کے ہر صفحے کے ساتھ ساتھ آخر میں بھی دستخط کیے لیکن اس کی تاریخ نہیں بتائی۔ اس کے بعد اس نے اسے لکھنؤ میں جسٹس کدوئی کو بھیج دیا۔ فیصلہ سنائے جانے سے پہلے ہی 24 دسمبر 1962 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے بعد، 5 جنوری 1953 کو، ان کے بھائی جج جسٹس کدوائی نے عدالت کا "فیصلہ" سنانے کا ارادہ کیا۔ اس نے اس پر دستخط کیے اور اس کی تاریخ مقرر کی۔ جس تاریخ کو انہوں نے اس پر رکھا وہ 5 جنوری 1953 تھی، جسٹس بھارگو کے دستخط ابھی بھی موجود تھے اور فیصلہ پڑھنے والا اور حقائق

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

کو نہ جاننے والا کوئی بھی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ جسٹس بھارگو 5 جنوری 1953 کو حوالگی میں فریق تھے۔ اپیل مسترد کر دی گئی اور سزائے موت کی توثیق کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ "فیصلہ" اپیل سننے والے دو ججوں میں سے ایک کی موت کے بعد درست طریقے سے دیا جا سکتا ہے۔

دلائل نے ایک وسیع رینج کا احاطہ کیا لیکن ہم اپنے آپ کو اس مقدمے کے حقائق تک محدود رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور صرف ان تنگ مسائل سے نمٹنا چاہتے ہیں جو یہاں پیدا ہوتے ہیں۔

فیصلہ سنانا ایک سنجیدہ عمل ہے جو اس میں شامل شخص یا افراد کے لیے سنگین نتائج کا باعث بنتا ہے۔ مجرمانہ مقدمے میں اس کا مطلب اکثر آزادی اور جیل کے درمیان فرق ہوتا ہے، اور جب قید کی سزا کے ساتھ سزا ہوتی ہے، تو یہ ایک قیدی کی حیثیت کو زیر سماعت سے مجرم کی حیثیت میں بدل دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سزا کی مدت فیصلہ سنائے جانے کے لمحے سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے یہ یقینی طور پر جاننا ضروری ہے کہ یہ نتائج کب اثر انداز ہونے لگیں گے۔ اس وجہ سے اس بات کا تعین کرنے کے لیے قواعد تیار کیے گئے ہیں کہ فیصلہ کس طریقے اور اس وقت سے نافذ ہونا ہے اور اسے ایک ایکٹ میں تبدیل کرنا ہے جو اس کے بعد حتمی ہے جہاں تک عدالت کا فیصلہ سنانے کا تعلق ہے۔

اب یہ اصول ایک جیسے نہیں ہیں، حالانکہ وہ ایک ہی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ مجموع ضابطہ فوجداری عدالت عالیہ کے ماتحت عدالت عالیان کا خیال رکھتا ہے۔ دفعہ 366 اور 424 ان سے متعلق ہیں۔ عدالت عالیان کو اپنے قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ اختیار اب آئین کے آرٹیکل 225 کے تحت دیا گیا ہے، یا اسے جاری رکھا گیا ہے۔

الہ آباد عدالت عالیہ نے 1952 میں اپنے موجودہ قواعد وضع کیے۔ وہ اسی سال 15 ستمبر کو نافذ ہوئے۔ ہم باب VII میں درج ذیل سے متعلق ہیں جو فیصلے اور ڈگری سے متعلق ہیں، یعنی قواعد 1 تا 4۔

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

یہ اصول چار مختلف حالات فراہم کرتے ہیں:(1) ایسے فیصلوں کے لیے جو مقدمے کی سماعت ہوتے ہی فوراسنائے جاتے ہیں؛(2)ان کے لیے جو مستقبل کی کسی تاریخ کوسنائے جاتے ہیں،(3)زبانی فیصلوں کے لیے، اور(4)ان کے لیے جو لکھے گئے ہیں۔یہ اصول کچھ جگہوں پر "تلفظ" اور دوسروں میں "ڈیلیور" لفظ استعمال کرتے ہیں۔وکیل نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کہا کہ ایک فیصلہ "واضح" اور "فراہم" دونوں ہونا چاہیے اور یہ کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

ہم ان قوانین کی تکنیکی طور پر بھی تشریح کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ وہ انصاف کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے بنائے گئے ہیں، جیسا کہ درحقیقت تمام قوانین ہیں اور انہیں بہت تنگ نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ اور نہ ہی ہم اس دائرہ اختیار کو کم کرنا چاہتے ہیں جس کی پریوی کونسل عدالت عالیان میں نشاندہی کرتی ہے تاکہ موت جیسے حادثات کی وجہ سے ہونے والے اچھے موروثی نقائص پیدا کیے جا سکیں۔چونکہ عدالتی کمیٹی کے اس فیصلے پر دلائل میں بھروسہ کیا گیا تھا اس لیے ہم اس اقتباس کا حوالہ دیں گے جو یہاں متعلقہ ہے۔یہ فرم گوکل چند بنام فرم نند رام ([1]) کے صفحہ 295 پر ہے۔حقائق یہاں جیسے نہیں ہیں کیونکہ فیصلہ دراصل بھری عدالت میں دیا گیا تھا اور بنچ تشکیل دینے والے دونوں جج موجود تھے اور اس میں متفق تھے۔لیکن اس پر دستخط ہونے سے پہلے ہی ایک جج چھٹی پر چلا گیا۔قواعد کے مطابق فیصلے پر اس وقت دستخط اور تاریخ طے کی جانی چاہیے جب اسے سنایا گیا تھا۔ان کے حاکموں نے کہا:-

> "قاعدہ یہ نہیں کہتا ہے کہ اگر اس کے تقاضوں کی تعمیل نہیں کی جاتی ہے تو فیصلہ کالعدم ہو گا۔لہذا حیران کن نتیجہ کے لیے واضح اور درست الفاظ کی ضرورت ہو گی۔درحقیقت قاعدہ کسی خاص وقت کی بھی وضاحت نہیں کرتا ہے جس میں اسے پورا کیا جانا ہے۔اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے وقت باقی ہے کہ کیا معقول ہے۔اصول اپنی نوعیت سے کسی فیصلے کے فریقین کے حقوق کو متاثر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔اس کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ فیصلہ کیا تھا۔یہ ایک قاعدہ ہے

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

جس کی ججوں کو اس مقصد کے لیے تعمیل کرنے کی ضرورت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عملی طور پر جج اس کی تعمیل کرتے ہیں، کیونکہ ایسا کرنا ان کا فرض ہے۔ لیکن حادثات ہو سکتے ہیں۔ایک جج فیصلہ دینے کے بعد مر سکتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ اسے اس پر دستخط کرنے کا معقول موقع ملے۔عدالت کو اس طرح کے عیب کی فراہمی کے لیے موروثی دائرہ اختیار ہونا چاہیے۔فیصلے پر دستخط کرنے سے پہلے چھٹی پر جانے والے جج کے معاملے میں مزید تبصرے کی ضرورت پڑ سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود عدالت کی سہولت اور مدعیوں کے مفاد کو غالب ہونا چاہیے۔عیب محض ایک بے ضابطگی ہے۔لیکن حقیقت میں سول پروسیجر کوڈ کی دفعہ 99 اور 108 کے ذریعے اس مشکل کو حل کیا جاتا ہے۔"

وہ ایک دیوانی مقدمہ تھا۔یہ ایک مجرمانہ ہے۔لیکن مجموع ضابطہ فوجداری کی دفعہ 537 مجرمانہ پہلو پر وہی کام کرتی ہے جو دفعہ 99 اور 108 دیوانی پر کرتی ہے۔ان میں بنیادی اصول ایک ہی ہے۔لیکن ہر الاؤنس دیے جانے اور غیر مناسب تکنیکی سے بچنے کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کے بعد بھی سوال یہ رہتا ہے کہ فیصلہ کیا ہے، کیونکہ یہ "فیصلہ" ہے جو کیس کا فیصلہ کرتا ہے اور فریقین کے حقوق اور آزادیوں کو متاثر کرتا ہے۔یہی معاملے کا بنیادی پہلو ہے اور جیسا کہ پریوی کونسل کہتی ہے، ان قوانین کا پورا مقصد اس بات کا یقین کرنا ہے کہ فیصلہ کیا تھا۔مجموع ضابطہ فوجداری کی دفعہ 369 کی وجہ سے یہ سوال کسی فوجداری مقدمے میں پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ-

"اس ضابطے کے ذریعہ یا اس وقت نافذ کسی دوسرے قانون کے ذریعہ یا کسی عدالت عالیہ کے معاملے میں، لیٹرز پیٹنٹ یا ایسی عدالت عالیہ کو تشکیل دینے والے دوسرے آلے کے ذریعہ فراہم کردہ کے علاوہ، کوئی بھی

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

عدالت، جب اس نے اپنے فیصلے پر دستخط کیے ہیں، تو اسے تبدیل یا جائزہ
نہیں لے گی سوائے اس کے کہ کسی علمی غلطی کو درست کیا جائے۔"

ہماری رائے میں، ان حصوں کے معنی کے اندر ایک فیصلہ عدالت کا حتمی فیصلہ ہے جو فریقین اور دنیا کو بھری عدالت میں باضابطہ "اعلان" یا "حوالگی" کے ذریعے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک عدالتی عمل ہے جسے عدالتی طریقے سے انجام دیا جانا چاہیے۔ اعلان کے انداز یا حوالگی کے طریقے میں چھوٹی بے ضابطگیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن چیز کا مواد وہاں ہونا چاہیے: جسے نہ تو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے قیاس آرائیوں پر چھوڑ دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ مبہم ہو سکتا ہے۔ باقی سب - جس طریقے سے اسے ریکارڈ کیا جانا ہے، جس طریقے سے اس پر دستخط اور مہر لگانے کی تصدیق کی جانی ہے، اس کے مواد اور معاملے کے بارے میں یقین کو محفوظ بنانے کے لیے بنائے گئے تمام قواعد - کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے ؛ لیکن بنیادی طور پر نہیں، یعنی فیصلے اور اس کے مندرجات کا باضابطہ طور پر عدالت طریقے سے بھری عدالت میں اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ کس طرح کلون ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ عدالت عالیان میں فیصلہ زبانی طور پر دیا جاتا ہے یا پڑھا جاتا ہے، کچھ میں صرف آپریٹو حصہ کا اعلان کیا جاتا ہے، کچھ میں فریقین کو نوٹس دینے اور معائنہ کے لیے مقررہ دنوں کے لیے میز پر مسودہ رکھنے کے بعد ہی فیصلے پر دستخط کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ جو فیصلہ اس طرح واضح یا مطلع کیا جاتا ہے وہ عدالت کے ذہن کا اعلامیہ ہونا چاہیے جیسا کہ اعلان کے وقت ہوتا ہے۔ ہم حوالگی کے طریقے یا انداز پر کوئی زور نہیں دیتے، کیونکہ اس کی اہمیت نہیں ہے، سوائے یہ کہنے کے کہ یہ بھری عدالت میں عدالت طریقے سے کیا جانا چاہیے۔ لیکن، تاہم، یہ کیا جاتا ہے کہ یہ حوالگی کے وقت عدالت کے ذہن کا اظہار ہونا چاہیے۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ فیصلے سے متعلق پہلا عدالت عمل ہے جو عدالت سماعت کے بعد انجام دیتی ہے۔ اس وقت تک باقی سب کچھ عدالت سے باہر کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد عملی ایکٹ ہونا نہیں ہے جو تمام نتائج طے کرتا ہے جو جاری فیصلے کے بعد ہوتے ہیں۔ جج آپس میں معاملے پر بحث کر سکتے ہیں اور اکثر کرتے ہیں اور کسی عارضی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ان کا

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

فیصلہ نہیں ہے۔ وہ مسودے لکھ سکتے ہیں اور ان کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ وہ فیصلے بھی نہیں ہیں، ان پر کتنی کثرت سے اور اکثر دستخط کیے گئے ہوں گے۔ حتمی آپریٹو ایکٹ وہ ہے جو اسے عدالت کا آپریٹو فیصلہ بنانے کے ارادے سے بھری عدالت میں باضابطہ طور پر اعلان کیا جاتا ہے۔ یہی "فیصلہ" تشکیل دیتا ہے۔

اب فیصلہ سنائے جانے تک ججوں کو اپنا ذہن تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ پچھتاوے کی ایک قسم ہے، اور درحقیقت آخری لمحات میں تبدیلیاں کبھی کبھی ہوتی ہیں۔ لہذا، تاہم، زیادہ تر مسودہ فیصلے پر پہلے ہی دستخط ہو چکے ہوں گے، یہ اور کچھ نہیں بلکہ ایک مسودہ ہے جب تک کہ عدالت کے فیصلے کے طور پر باضابطہ طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ تب ہی یہ ایک مکمل فیصلے میں واضح ہو جاتا ہے اور فعال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ وہ جج جو فیصلہ سناتا ہے، یا اسے بھائی جج کے ذریعے سناتا ہے، اسے حوالگی کے وقت عدالت کے رکن کے طور پر موجود ہونا چاہیے تاکہ وہ، اگر ضروری ہو تو، حوالگی روک سکے اور کہہ سکے کہ اس نے اپنا ذہن بدل لیا ہے۔ اسے عدالت میں ظاہری طور پر موجود ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اسے عدالت کے ایک رکن کے طور پر موجود ہونا چاہیے اور حوالگی کو روکنے اور اس کی طرف سے آخری لمحات میں ذہن میں کوئی تبدیلی آنے پر تبدیلی لانے کی حیثیت میں ہونا چاہیے۔ اگر وہ کوئی مسودہ پیش کرتا ہے اور اس پر دستخط کرتا ہے اور اشارہ کرتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی حتمی وضاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہے اور اپنا ذہن تبدیل کرنے کی حیثیت میں ہے لیکن حوالگی کو روکنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتا ہے تو حوالگی کے وقت بھی یہ اس کے خیالات ہیں۔ لیکن کوئی یہ فرض نہیں کر سکتا کہ اگر وہ اب ایسا کرنے کی حیثیت میں نہ ہوتا تو وہ اپنا ذہن نہیں بدلتا۔ جج کی ذمہ داری بھاری ہوتی ہے اور جب کسی شخص کی زندگی اور آزادی اس کے فیصلے پر منحصر ہوتی ہے تو کچھ بھی موقع یا شک یا قیاس آرائیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا؛ یہ بھی عوام کا سوال ہے۔ پالیسی شامل ہے۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اکثر یہ رواج ہے کہ مسودہ، بعض اوقات دستخط شدہ مسودہ، کسی بھائی جج کو بھیجا جاتا ہے جس نے بھی کیس کی سماعت کی ہو۔ یہ محض اس کی معلومات کے لیے، یا غور و فکر اور تنقید

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

کے لیے ہو سکتا ہے۔ مسودے پر محض دستخط کرنا لازمی طور پر بند دماغ کی نشاندہی نہیں کرتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ عوامی پالیسی کے خلاف ہو گا کہ تحقیقات کے لیے دروازہ کھلا رکھا جائے کہ آیا کسی جج کی طرف سے بھیجے گئے مسودے کو اس کی حتمی اور ناقابل تبدیلی رائے کو مجسم بنانے کے لیے شامل کیا گیا تھا یا اس کا مقصد صرف ایک عارضی مسودہ ہونا تھا جو اس غیر تحریری تفہیم کے ساتھ بھیجا گیا تھا کہ وہ اپنا ذہن تبدیل کرنے کے لیے آزاد ہے اگر فیصلہ سنانے سے پہلے اس پر تازہ روشنی پڑے۔

اس طرح کے خیالات کا اظہار کلکتہ عدالت عالیہ کے نو ججوں پر مشتمل ایک مکمل بنچ نے سال 1867 میں محمد اکیل بنام اسد نسابیبی ([1]) میں کیا تھا۔ اس معاملے میں، بینچ کی تشکیل کرنے والے سات ججوں میں سے تین نے دستخط شدہ فیصلے عدالت کے رجسٹرار کے حوالے کیے۔ فیصلہ سنائے جانے سے پہلے ہی ان میں سے دو سبکدوش ہو گئے اور ایک کی موت ہو گئی۔ نو ججوں پر مشتمل ایک مکمل بنچ اس بات پر غور کرنے کے لیے طلب کی گئی تھی کہ آیا ان تینوں ججوں کے مسودوں کو عدالت کے فیصلوں کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ سیٹن کیر جسٹس، جس نے ان کے ساتھ معاملہ سنا تھا، نے کہا-

> "یقینی طور پر جہاں تک مجھے یاد ہے، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر مکمل طور پر اپنا ذہن بنا لیا تھا جس پر انہوں نے بہت سنجیدگی سے غور کیا تھا، اور جس پر انہیں حتمی فیصلہ کرنے کے بے پناہ مواقع ملے تھے۔ تاہم، میں ہوں۔ یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ انہوں نے مزید غور نہ کرتے ہوئے اپنی رائے تبدیل کر لی ہے۔" (صفحہ 13)

اس کے باوجود، تمام نو جج اس بات پر متفق تھے کہ ان تینوں رائے وں کو اصطلاح کے رسمی معنوں میں فیصلے کے طور پر نہیں مانا جا سکتا۔ ہماری رائے میں، جسٹس جیکسن نے ان الفاظ میں قانون کا صحیح اظہار کیا:-

تاہم میں ہمیشہ سے سمجھتا ہوں کہ سخت عمل میں یہ ضروری ہے کہ فیصلے بھری عدالت میں سنائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ آج ہم ان اپیلوں پر فیصلہ سنانے کے لیے پہلی اور واحد بار ملے ہیں۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جن ججوں کی موت ہو چکی ہے یا وہ عدالت سے سبکدوش ہو

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

چکے ہیں وہ آج سنائے جانے والے فیصلے میں شامل نہیں ہو سکتے اور اس سے اپنی عَدمِ تقلید کا اظہار نہیں کر سکتے۔"(صفحہ 5)

چیف جسٹس پیکاک نے صفحہ 30 پر اشارہ کیا:

> "عدالت کی تشکیل کرنے والے انفرادی ججوں کے محض دلائل اور رائے کے اظہار فیصلے نہیں ہیں۔ قانون کی نظر میں فیصلہ پوری عدالت کا حتمی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ نو جج ہیں کہ نو فیصلے ہوتے ہیں۔ جب متعدد ججوں میں سے ہر ایک جس میں ایک سادہ عدالت تشکیل دی گئی ہے الگ الگ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے جب وہ سب جمع ہوتے ہیں، تب بھی صرف ایک فیصلہ ہوتا ہے، جو ایک ڈگری کی بنیاد ہے۔ اگر یہ دوسری صورت میں ہوتا، اور اگر موجودہ موقع پر بھیجی گئی ہر یادداشت ایک فیصلہ ہوتی، تو ایک معاملے میں نو فیصلے ہوتے، جن میں سے کچھ ایک چیز کا فیصلہ کرتے اور کچھ دوسرے کا فیصلہ کرتے، اور ہر جج کو اپنے فیصلے کا الگ سے جائزہ لینا پڑتا، اگر جائزے کے لیے درخواست دی جانی چاہیے۔"

ہم ان تمام باتوں سے متفق نہیں ہیں جو اس معاملے میں فاضل چیف جسٹس اور دیگر ججوں کی طرف سے آئیں لیکن، ہماری رائے میں، اوپر دیے گئے حصے حقیقی اصول کو ظاہر کرتے ہیں اور اس کی وجوہات کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔

جیسے ہی فیصلہ دیا جاتا ہے، یہ عدالت کا عملی اعلان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد قانون اس طریقے کی فراہمی کرتا ہے جس میں اس کی تصدیق کی جانی چاہیے اور اسے یقینی بنایا جانا چاہیے۔ اس سے متعلق اصول مختلف ہیں لیکن وہ معاملے کا جوہر نہیں بناتے ہیں اور اگر ان پر عمل کرنے میں بے ضابطگی ہے تو یہ قابل علاج ہے۔ اس طرح، اگر کسی فیصلے پر دستخط نہیں ہوتے ہیں اور اس پر نادانستہ طور پر کارروائی کی جاتی ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جاتا ہے، تو اس کے نتیجے میں ہونے والی کارروائی درست ہو گی کیونکہ فیصلہ، اگر اسے درست طریقے سے پیش کیا گیا ہے، تو اس کے بعد کی توثیق کے طریقے میں نقائص کے باوجود ٹھیک رہے گا۔

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

فیصلہ سنائے جانے کے بعد نظر ثانی کے لیے التزام کیا جاتا ہے۔ ایک شق یہ ہے کہ اسے آزادانہ طور پر تبدیل یا ترمیم یا یہاں تک کہ مکمل طور پر مزید رسمی طور پر تبدیل کیا جا سکتا ہے، سوائے فریقین کو نوٹس دینے اور تبدیلی کے نقطہ پر دوبارہ سماعت ضروری ہو، بشرطیکہ اس پر دستخط نہ کیے گئے ہوں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ دستخط کے بعد مناسب طریقے سے نظر ثانی دیوانی مقدمات میں ہو گی لیکن فوجداری مقدمات میں کوئی نہیں ہو گا۔ لیکن جب جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کی اجازت صرف انتہائی تنگ بنیادوں پر دی جاتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں محض یہ حقیقت کہ ایک جج مر چکا ہے اور اس لیے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتا، اس فیصلے کی صداقت کو متاثر نہیں کرتا جو پہلے ہی دیا جا چکا ہے اور موثر ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے ایسے فیصلوں کے درمیان فرق ہے جو پیش نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے فعال نہیں ہوئے ہیں اور جو ہیں۔ سابقہ معاملے میں، تبدیلی عدالت سے باہر ہے۔ یہ عدالتی عمل نہیں ہے۔ یہ حتمی نتیجے پر پہنچنے کے عمل کا صرف ایک حصہ ہے؛ یہ بھی کہ بھری عدالت میں ججوں کے ذہن کا کوئی باضابطہ عوامی اعلان نہیں ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں کوئی "فیصلہ" نہیں ہوتا ہے جس پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن حوالگی کے بعد فریقین کو اطلاع دیے بغیر تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور کارروائی بھری عدالت میں ہونی چاہیے، اور اگر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے تو ایسی کوئی چیز ہے جو حتمی اور فیصلہ کن ہے اور جس پر فوری طور پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہے۔ ایک معاملے میں، کوئی نہیں جان سکتا، اور یہ جاننا عوامی پالیسی کے خلاف ہو گا کہ آیا فیصلے کا مسودہ جج کا حتمی نتیجہ ہے یا صرف ایک عارضی رائے ہے جو تبدیلی اور تبدیلی سے مشروط ہے۔ دوسرے معاملے میں، جج نے عوامی طور پر اپنے ذہن کا اعلان کیا ہے اور اس لیے فریقین کو اطلاع دیے بغیر اور جب ضروری ہو تو انہیں نئے سرے سے سنے بغیر اسے تبدیل نہیں کر سکتا؛ اور اگر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے تو فیصلہ نافذ رہتا ہے۔ تبدیلی سے ہمارا مطلب فیصلے میں تبدیلی ہے نہ کہ محض استدلال کے حصے کا اضافہ یا تخفیف۔

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document

ہمارا نتیجہ یہ ہے کہ جو فیصلہ جسٹس کدوا، 5 جنوری 1953 کو دینا چاہتے تھے، وہ درست فیصلہ نہیں تھا کیونکہ بینچ کے دوسرے رکن کی اس کی فراہمی سے پہلے ہی موت ہو گئی تھی۔

اپیل کی اجازت دی جاتی ہے اور عدالت عالیہ کا حکم جسے اس کا فیصلہ قرار دیا جاتا ہے اسے کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ اپیل کی سماعت کرنے والی بنچ اور توثیق کی کارروائی کے لیے درست فیصلہ دینا اب ممکن نہیں ہے اس لیے ہم مقدمے کو دوبارہ سماعت اور مناسب فیصلے کی فراہمی کے لیے عدالت عالیہ کو واپس بھیج دیتے ہیں۔

1953. 23 نومبر۔ جسٹس بوس۔ 25 مئی 1953 کا حکم امتنائی اب خود ہی ختم ہو گیا ہے۔ سزائے موت پر عمل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اپیل کا کوئی درست فیصلہ اور کوئی درست تصدیق نہیں ہے۔ اس حوالے سے موقف ویسا ہی ہے جیسا کہ عدالت عالیہ میں اپیل کے وقت تھا۔ دوسرے اور تیسرے اپیل گزار اپنی ضمانت چھوڑ دیں گے کیونکہ اب وہ اس حیثیت پر پہنچ چکے ہیں جس پر وہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کیے جانے کے وقت فائز تھے۔

اپیل کی اجازت دی گئی۔

اپیل کنندہ کا ایجنٹ: نونیت لال۔

جواب دہندہ کے لیے ایجنٹ: سی پی لال

Ilyas Ahmed Pandit
2024.07.29 12:48
I attest to the accuracy and
integrity of this document